

جناب مصطفیٰ حسن فردوسی۔ ڈھاکہ

مولانا محمد علی جوہر

کے

سیاسی بے انصافی

جس طرح چاند کہنے سے چاندنی کا تصور پہاڑ کہنے سے بلندی کا خیال، آفتاب کہنے سے اسکی

تمازت کا احساس دل میں آنا ضروری ہے، اسی طرح انڈیا اور پاکستان کی جنگ آزادی کا نام لیتے ہی سے چند شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا خیال ذہن میں لازمی طور پر آتا ہے، انہیں چند ہستیوں میں مولانا محمد علی جوہر کی ایک ہستی ہے، وہ جنگ آزادی کے ہیرو تھے جس کے کردار کو ہٹا لینے کے بعد پوری کہانی خشک اور بے حقیقت ہی ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے باوجود بھی ان کے معاملہ میں جنگ آزادی پر کتاب لکھنے والوں نے جو اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا ہے، وہ بڑا شرمناک ہے۔ آزادی کی جدوجہد | برصغیر ہندوستان میں جنگ آزادی کی کہانی بڑی پرانی ہے۔ دراصل ۱۷۵۷ء ہی سے شروع ہوئی جب کہ بنگال میں انگریزوں نے سازش اور نواب مرارج الدولہ کے خاص خاص معتمدوں کو غداری پر آمادہ کر کے جنگ پلاسی میں فتح حاصل کی۔ شروع دور میں تو اجتماعی حیثیت سے عوام نے غیر منظم طور پر ادھر ادھر چڑ بار کوششیں کیں، لیکن فرنگیوں کی منظم اقلیت کے سامنے بھاری اکثریت مگر غیر منظم ہندوستانیوں کی کچھ چل ہی نہ سکی، جہاں کامیابی کے امکان روشن تھے اور جہاں انگریزوں کو سخت مقابلہ کا خدشہ تھا، وہاں انہوں نے غداروں کا سہارا لیا اور ملت فردشوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر حریت پسندوں کی کوششوں پر جبر و استبداد کی ہر گواہی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک عرصہ تک تو خاموشی رہی۔ اس لئے کہ انگریزوں نے جس طرح قتل عام

کے ذریعہ عوام کو خوفزدہ کر رکھا تھا، اس کے پیش نظر کوئی رہنمائی کے لئے آگے آتا ہی نہیں تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد نئے حالات اور نئے رجحانات کے ماتحت آزادی پسندوں نے کام شروع کیا اور آخر کار ایک مدت کی اکھاڑ پھار کے بعد آزادی حاصل کر کے رہے۔ اس کشاکش کے دور میں آزادی شخصیتوں کی سیاسی سوچ بوجھ اور ان کی مخلصانہ کوششوں نے منتشر اور شکستہ دل عوام کو منظم اور ان میں اعتماد پیدا کرنے میں بڑا کام انجام دیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد ہندوستان میں کافی رہی۔ سب سے بڑا نام آج غلط یا صحیح طور پر انڈیا پاکستان کی تاریخی جنگ آزادی میں لیا جاتا ہے۔ لیکن صرف ایک شخصیت ایسی ہے جو اپنے بے پناہ خلوص اور خداست کے لحاظ سے صف اولین میں سب سے اونچا درجہ دئے جانے کے لائق ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا کہیں نام نہیں لیا جاتا۔ یہ ہستی مولانا محمد علی جوہر کی ہے۔

محمد علی جوہر کے ساتھ بے انصافی | مولانا محمد علی کو گزرے ہوئے آج تیس برس ہو گئے ہیں، لیکن عوام کے دلوں میں ان کا احترام ہونے لگا ہے، اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کا احترام اور ان کی یاد عوام کے دلوں میں سینہ بسینہ ایک پشت سے دوسری پشت تک آتی نہ رہے، یہاں تک کہ اس وقت تک باقی رہے جب تک کہ برصغیر ہندوپاک میں ہندوستان کی آزادی کا صحیح قدروں زندہ ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے شکستہ دل عوام کو جرات بخشی۔ انہوں نے ان زبانوں کو جن پر ظلم و استبداد کی مہریں لگادی گئی تھیں، دوبارہ زبان بخشی اور اپنی ہر دلی اپنے جذبہ اور ہمت شوق سے ہمیشہ کے لئے ختم کیا۔ لیکن افسوس کہ اس مجاہد اعظم کا تذکرہ جنگ آزادی کی کتابوں میں نہیں کیا جاتا۔ ہم اس بے انصافی اور بددیانتی کو سیاسی اغراض ایک سانحہ عظیم، ایک شرمناک حرکت کہنے پر حتیٰ بجانب ہوں گے۔

آزادی سے متعلق اردو، انگریزی اور ہندی سبھی زبانوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے مولانا محمد علی کے سامنے سیاسی زندگی میں ڈالنے اور بہت سے مصنفین کی طرح ان سے بولنے اور کام کرنے کا طریقہ سیکھا اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے ان کو آزادی کے کارواں سے الگ چلتے دیکھ کر پیچھے سے راہ لی لیکن اب تک جتنی کتابیں خصوصیت کے ساتھ بھارت میں لکھی گئیں وہ سب کی سب تقریباً قصہ ہندو بددیانتی کے ساتھ لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں ادل تو محمد علی مرحوم کا نام ہی نہیں آتا اور کہیں کہیں پر آتا ہے تو اس طرح جیسے محمد علی آزادی کی جنگ میں ایک معمولی حیثیت کے مالک تھے اتنی بڑی شخصیت کے ساتھ اتنی بڑی بے انصافی کیوں کی گئی۔ یہ ایک سرسبزہ راز معلوم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مولانا ابوالکلام آزاد

۔۔۔ مولانا محمد علی سے بہت کچھ استفادہ کیا ہوگا۔ انہوں نے بھی اپنی کتاب ”انڈیا ونس فریڈم“ (INDIA WINS FREEDOM) میں کچھ تذکرہ نہیں کیا۔ صرف صفحہ نو اور دس میں مولانا محمد علی کا نام آتا ہے، وہ بھی فرنگی محل کے مولوی باری صاحب کے توسط سے آتا ہے، ورنہ محمد علی کے ناموں سے، زیادہ تذکرہ حکیم اجل خاں، لالہ لاجپت رائے، سی آر، داس اور بین چند رائل، وغیرہ جیسی سرگند لائن آف ڈیفنس کی شخصیتوں کا ہے۔

انڈیا ونس فریڈم میں تذکرہ نہیں | ”انڈیا ونس فریڈم“ کا حجم ڈھائی سو صفحہ پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد نے اس کتاب میں اپنی خاندانی وراثت اور بچپن سے لے کر تقریباً اپنی زندگی کے آخری پہلو تک تمام موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان موضوعات میں ایسے بھی موضوع ہیں جنہیں صحیح معنوں میں ہندوستان آزادی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ گھڑکی باتیں ہیں جنہیں گھڑی کے ماحول تک رہنا چاہئے تھا۔ کتاب کی تفصیل کے بارے میں اس میں مولانا محمد علی کی خدمات کا کہیں اعتراف نہیں ملتا، حالانکہ پنڈت نہرو، اپنی کتاب ”ڈسکوری آف انڈیا“ (DISCOVERY OF INDIA) میں صفحہ ۳۵۲ میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ مولانا نے خلافت کی تحریک اور کانگریس پارٹی کے بنانے میں بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ مولانا کافی عرصہ تک کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے سب سے اعلیٰ رکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے، گاندھی جی جنہیں مولانا محمد علی جوہرؒ نے صحیح معنوں میں جنگ آزادی کے پلیٹ فارم پر لاکر انہیں مسازیل سے متعارف کرایا اور ان کے ارادے اور طریقہ کار میں ایک نئی جان پیدا کی۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے اور ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ بھارت کی آزادی کی تاریخ مکمل ہی نہیں کہی جاسکتی۔ جب تک کہ گاندھی جی جیسے حریت پسند کا تذکرہ نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ ایک منصف مزاج انداز یہی کہے گا کہ آزادی کی تاریخ بلاشبہ اس وقت تک بھی مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ جب تک کہ اس میں محمد علی جوہرؒ کی بے لوث خدمات کا اعتراف نہیں کیا جائے۔

طیفیل احمد منگلوری کی طرف سے زیادتی | اسی قسم کی سلسلہ میں ایک کتاب ”مسلمانوں کا روشن مستقبل“ کے نام سے طیفیل احمد منگلوری نے لکھی۔ مولانا آزادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی شخصیتوں نے اس کتاب کے متعلق رائے بھی ظاہر کی اور یہ لکھا ہے کہ ”مسلمانوں کو جو ملک کی سیاسی صورت حال کے ساتھ سمجھنا چاہئے ہیں۔ میں مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔“ اس کتاب میں ۶۲۲ صفحے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب ”بنیادی حقوق پر ایک نظر“ سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کا اختتام ”بنیادی حقوق کا غاسبہ“ پر ہوتا ہے۔ درمیان میں مسلمانوں کی

حکومت، ان کے اوصاف و فضائل، ان کا انحطاط، انگریزوں کا تسلط اور پھر تحریک آزادی کے تمام پہلوؤں پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ دلچسپ تو یہ ہے کہ کتاب میں خلافت کی تحریک کے عنوان سے بھی ایک علیحدہ باب ہے۔ لیکن انتہائی افسوسناک اور حیرت انگیز یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس باب میں بھی مولانا محمد علی جوہر کا کوئی تذکرہ نہیں، حالانکہ یہ بات اجماعی ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ خلافت کی تحریک کے میر کا روان محمد علی جوہر ہی رہے۔ انہوں نے اس تحریک میں جان ڈالی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلہ کو جگہ دی جا سکتی ہے، مگر ان مصنفوں کے نزدیک مولانا محمد علی کا کوئی مقام نہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ملک کی سیاسی صورت حال جاننے کیلئے اس کتاب کے مطالعہ کی اہمیت تو دی ہے، لیکن کوئی رائے اس پر ظاہر نہیں کی کہ مجاہد اعظم کا تذکرہ اس کی کتاب میں کیسے بغیر یہ کتاب معنوی لحاظ سے نامکمل ہے۔

محمد علی میدان عمل میں | مولانا محمد علی سلمہ کی کہر آلود صبح میں کلکتہ پہنچے، اس وقت دہلی ان کا کوئی جانا پہچانا بھی نہیں تھا، معادن تو درکنار، ارادہ یہ تھا کہ قوم خوابیدہ کو صحافت کے ذریعہ جگایا جائے، اخبار کی اشاعت کا کام بذات خود ہی بڑا ہی آلام و مصائب سے بھرا ہوا کام ہے۔ اس پر یہ کہ کوئی مالی تعاون یا ہمت افزائی کرنے والا نہیں۔ اسی وقت انہیں ایک طویل ٹیلیگرام ملا جس میں کہ ایک ریاست کے وزیر اعلیٰ ہونے کی سرکاری دعوت دی گئی تھی۔ اس سے قبل بھی انہیں کئی بار ریاست کے وزیر اعلیٰ بننے کی دعوت دی جا چکی تھی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔

ریاستی زندگی کے حکمران یا حاکم اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے جو ٹھکانہ اس وقت لوگ کیا کرتے اس کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آج کا وزیر اعظم بھی ویسے افراتفر اور آتش کی زندگی نہیں گزار سکتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود مولانا محمد علی سلمہ اس ٹیلیگرام کو اس وقت تک نہ کھولا جب تک کہ ان کا کامریڈ اخبار الرجزوی سلمہ کو شائع نہ ہو چکا مبادا کہ ٹیلیگرام کے اندر بڑی اور بھرپور دعوت ان کے پاسے ثبات میں لغزش نہ لاوے۔ وہ قومی خدمت کی رست کی زندگی کو بہترین تو فحاشی اور افراتفر کی زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔

ان کے ہم عصر جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں میں بھی زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی جو روزمرہ کی زندگی میں آرام و آسائش کی زندگی کو پسند کرتے تھے اور ان کے ہاں بھی زیادہ تر ایسے ہی لوگ پلیٹ فارم پر آئے جن کا رہن رہن عوام کے رہن رہن سے بالکل مختلف تھا۔ یہ خلافت کے

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی زندگی سادہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ ہزاروں کے مجمع میں کھڑے تو پھر بغیر صورت سے پہچانے ہوئے انہیں لباس سے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا، کہ وہی شخص ہے جسکی ایماء پر مسلمانان ہند اپنا مال اور اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رکھتے۔

ایچ۔ جی۔ ویلیس کا خراج تحسین | انگریزی کا مشہور و معروف مصنف ایچ۔ جی۔ ویلیس مولانا محمد علی کی عظمت ان جملوں میں پیش کرتا ہے۔

HE HAD THE HEART OF NEPOLEAN, PEN OF MACAULAY AND

YOUNG OF BREEK.

وہ نپولین کا دل، میکاے کا قلم اور برک کی زبان رکھتے تھے۔

ان تینوں شخصیتوں سے تعارف رکھنے والے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایچ۔ جی۔ ویلیس کس حد تک مولانا محمد علی کی اعلیٰ صلاحیتوں اور بے پناہ ہمت و جرات کا معترف ہے، کسی انگریز مصنف نے برصغیر ہندو پاک کی شخصیتوں میں سے اتنا بڑا خراج تحسین کسی کو پیش نہیں کیا۔

عوام ہمیشہ محمد علی کو یاد کریں گے۔ اب جہاں تک ان کی سیاسی و قومی خدمات کا تعلق کامرٹھ کے فائنل۔ مولانا محمد علی کی تقریریں اور ان کی تحریریں جو منتشر اوراق میں پھیلی ہوئی ہیں، وہ آنے والی نسلیں کو بتا سکتی ہیں کہ مولانا محمد علی کی شخصیت ایک جنگ آزادی کے مجاہد کی حیثیت سے کتنی بلند اور ارفع تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے آپ کو قوم کے خادم کی حیثیت سے پروانہ وار کام کرتے دیکھا ہے، گہرا سچ خال خال ہیں، لیکن پھر بھی جو باقی ہیں وہ ان کی یاد میں ہندو قوم کی خاطر سرفروشی کے نئے تازہ دم ذراستے تھے۔

غیر ہانک میں محمد علی نے ہندوستان کا تعارف کرایا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگلینڈ، امریکہ اور

بگاریوین مائک میں جس نے مورخوں، ناقدوں، ادیبوں، سیاست دانوں، مقررین اور عوام الناس کو یہ بتایا کہ ۱۵۰۰ میل لمبی اور ۲۰۰۰ میل چوڑی سرزمین، ہندوستان میں صرف گھاس پھوس نہیں بلکہ آدھار کے نوابان انسان بستے ہیں۔ وہ دراصل مولانا محمد علی جوہر کی داستان تھی، وہ نہ سٹر گاندھی ہو یا سی۔ آر۔ م۔ یا مولانا ابوالکلام آزاد، کسی کی بھی شخصیت ایسی نہیں تھی جس نے ہندوستان کی آزادی کے نظریہ کو اتنا طوطہ پروا اور اس بیانی سے پیش کیا تھا۔

ہمت و جرات کی بے پایاں مثال | کراچی میں مولانا محمد علی کے خلاف غداری کا مقدمہ چلایا

یہ ۱۹۵۱ء کا زمانہ تھا، اس مقدمہ کی روئیداد جنہوں نے پڑھی یا سنی ہے، انہیں بخوبی معلوم ہے کہ ا

شخص کا دل ملک و ملت کے لئے وقف الم تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے جب آزادی کی کوشش کو بار آور ہوتے نہیں دیکھا تو انہوں نے اپنی زبان سے اللہ کے راستہ میں لوٹ آنے کی دعا کی جو مستجاب ہوئی ہے

اللہ ہی کے رستہ میں جو موت آئے تو اچھا اکیر یہی ایک دعا میرے لئے ہے

بیس سال کی مستقل جدوجہد اور پریشانی کے بعد چوتھی بار مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوئے، یہ نومبر سنہ ۱۹۴۷ء کی بات تھی۔ اس وقت آپ کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ ڈاکٹر مسلسل انہیں آرام کے لئے تاکید کر رہے تھے عزیز واقرباء دوست احباب جتنے تھے سبھوں نے لندن کے سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن آپ نے جواب یہ دیا کہ مجھے تین دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ ۱۔ فیا بیٹس، اس سے نمٹ لوں گا۔ ۲۔ حکومت برطانیہ، تو اس سے بخوبی لڑوں گا۔ ۳۔ صرف ایک دشمن ہے، جس کے بارے میں کہہ نہیں سکتا اور وہ موت ہے آپ نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ شدید بیمار یوں کے بعد بھی آپ لندن پہنچے اور سینٹ جیمس ہسپتال میں آزادی یا موت کے عنوان سے ایک یادگار تقریر کی، جو آج بھی شائقین انگریزی کو یاد ہوگی۔ اس تقریر کا ہر جملہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ آزادی کی جنگ میں مولانا محمد علی کا مقام گاندھی، پنڈت نہرو، ڈاکٹر مونسے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے کہیں بلند تر تھا۔ اس لئے کہ آپ ہندوستان کی مکمل آزادی کے خواہاں تھے جب کہ گاندھی جی سے نیکو تمام کانگریسی ممبران اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ ہندوستان ڈومینین اسٹیٹس ہی مل جائے، آپ کی اس آخری تقریر کے چند جملے یہاں درج کئے جاتے ہیں، جس سے قارئین کو ان کی جرات اور ہمت مردانہ کا اندازہ ہو۔

”سٹرچیرمین، ہندوستان میں ہم ۳۲ کروڑ کی تعداد میں ہیں، جبکہ ہم لاکھوں لاکھ کی تعداد میں وہاں اور قوطیں مر سکتے ہیں، تو بلاشبہ ہم برطانیہ کی گولیوں کو سینوں پر برداشت کرنے کی جرات کر سکتے ہیں۔ دنیا میں آج تک کوئی جنگ صرف مارنے کے حوصلے سے نہیں لڑی گئی بلکہ میدان جنگ جیتنے کیلئے مرنے کا بھی حوصلہ رکھتا ہو۔ ہم ہندوستانیوں نے مرنے کا بھی حوصلہ پیدا کیا ہے اور یہ سمجھ لو کہ ۳۲ کروڑ انسان کو گولی کا نشانہ بنانے کی ہمت تم میں نہیں آسکتی۔ کیا تم ۳۲ کروڑ انسانوں کے ہلاک کر دینے کی کوئی مشین بنا سکتے ہو، اگر بنا بھی تو تو تمہارے اندر وہ حوصلے ہیں۔“

میں اسی وقت یہاں سے جاسکتا ہوں، جب کہ مجھے آزادی مل جائے ورنہ

میں ایک غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ وطن سے دور غیر ملک میں ہی مرنا پسند کروں گا۔ جب تک کہ یہ ملک آزاد ہے اور اگر تم مجھے آزادی نہ دے سکتے تو تمہیں مجھے قبر دینی ہوگی۔“

یہ ان کی تڑپتی ہوئی تقریروں کے چہرے جھلکے بھتے جو ترجمہ کر کے پیش کر دئے گئے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہی ان کی بے لوث خدمات اور بے باک جذبہ حب الوطنی کی ترجمانی کرتا ہے، شاید اتنی جرات آج تک پاکستان کے کسی بھی لیڈر میں نہ آسکی جو لندن میں جا کر تاج برطانیہ کے سامنے آزادی کی خاطر لڑکارے۔

سید سلیمان ندوی کا خراج تحسین | مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے قلم سے ان کے انتقال کے بعد خراج عقیدت پیش کیا وہ بھی کچھ ایسے کے لائق ہے۔

”اٹھویں پروردگار جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے سر قیامت آفریں، سانحہ بنارس کے شور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی۔ وہ اپنے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بتایا سمجھاتا تھا، اور اوروں کو بتایا کرتا تھا، درینا کہ قیامت تک کیلئے ساکن ہو گیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، جس زمانہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔“

قومیت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو۔ تو ملت اسلامیہ کا سو گوار تھا، فرما ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے تو دنیائے اسلام کا ماتم کناں تھا، مرزا وار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے۔ ہندوستان کا ماتم دار طرابلس کا سو گوار، عراق کیلئے غمزہ، بلقان کے لئے اشک باری، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خوانی، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم۔۔۔ اے ہند کسے آوارہ گرد مسافر تیرا حق سر زمین اسلامیہ کے چپے چپے پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لئے اولین قبلہ اسلام کا سجدہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔“

محمد علی جوہر سے مولانا مرحوم کی ملاقات سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں الہلال کے دفتر کلکتہ میں ہوئی۔ اس وقت کامریڈ کوٹکے گریپہ صرف دو سال ہوئے تھے، لیکن اس دو سال میں کامریڈ کی آواز کلکتہ اور دہلی سے نکل کر بھنگم ملیں میں لگ رہی تھی، اور دنیا کا چپے چپے مولانا محمد علی کی پکار سن چکا تھا۔

آج لیڈروں نے ان سے عمل کا طریقہ سیکھا۔ | مولانا محمد علی دہلی میں کوچہ چلیاں میں مقیم تھے۔ ان کی رہائش گاہ اس وقت سیاست کا مرکز تھا جہاں گاندھی جی سے لیکر ہندوستان کا ہر چھوٹا اور بڑا لیڈر آتا اور ان کی قیام گاہ کے صحن میں بیٹھ کر سیاست کی چال سمجھتا، سیاست کی زبان سیکھتا اور جرات رندانہ کا سبق حاصل کرتا۔ محفل بارونتی ہوا کرتی اور درجنوں حضرات مولانا مرحوم سے بات چیت کرتے رہتے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے کوئی بھی مصنف اگر وسعت قلب و نظر رکھنے کے سبب فراموش تو کر سکتا ہے لیکن جھٹلا نہیں سکتا۔

دیوان سنگھ مفتون کا خراج تحسین | مولانا محمد علی کانگریس کے صدر بھی رہے۔ بقول پنڈت نہرو انہوں نے کانگریس کو نئی روح اور ہمت بخشی، لیکن پھر بھی کانگریس سے علیحدہ محاذ بنانے کی ضرورت کیوں محسوس کی، یہ ایک علیحدہ موضوع بحث ہے جس کی طوالت میں پڑنا میرا یہاں پر کام نہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے ہندو معتقدین میں سے ایک شخص جناب دیوان سنگھ مفتون نے اپنی تحریر میں یہ اعتراف کیا ہے کہ "مولانا نے کانگریس سے علیحدگی کانگریس کے لیڈروں کی حماقتوں کی وجہ سے اختیار کی؟ مردم ناشناسی اور بے قدری کے باعث کانگریس مولانا جیسی بے ریا، لائق اور بلند شخصیت سے محروم ہو گئی۔ اور یقیناً یہ ہندوستان کی بد نصیبی تھی کہ لارڈ اردن ملنے کے لئے جب پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر پٹیل وغیرہ کا ڈپوٹیشن تیار ہوا تو ان لیڈروں نے مولانا کو پوچھا تک نہیں تھا؟ دیوان سنگھ مفتون نے جو جائزہ لیا وہ ان کا اپنا نظریہ ہے ورنہ دراصل بات یہ تھی کہ ۱۹۱۱ء میں جب بنگال کی سابق تقسیم کو ختم کر کے متحدہ بنگال کر دیا گیا، اسی وقت مولانا کو برطانیہ اور ہندوؤں کے ساتھ اعتماد نہ رہا۔ اور جوں جوں وقت گذرتا گیا اور آزادی کی تحریک کے اثرات بڑھ کر پکڑنے لگے، مولانا مرحوم کو روز بروز روشن کی طرح عیاں ہوتا گیا کہ کانگریس کانیشنلسٹ نعرہ ایک سیاسی فریب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ بلکہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے جس میں مسلمانوں کے لئے کوئی فلاح نہیں، لہذا انہوں نے اپنا لائحہ عمل اسی وقت بدل دیا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے کانگریس ہی کو مسلمانوں کے لئے نجات دہندہ پارٹی سمجھ کر اس میں شریک رہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کی ذات کیساتھ چنانچہ کتابوں میں جو بددیانتی برتی گئی وہ اس سیاسی اختلاف کے باعث ہوئی اور دوسری وجہ ان کی جانب سے تصدق اور عمدہ بے توہی سے پیش آنے کی یہ کہی جاسکتی ہے کہ چونکہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ اگر ان کا تذکرہ دیا نہ جاسکے کیا جاتا تو دوسرے بہر دان راہ آزادی کا کوئی شمار نہیں ہوتا۔